آیۂ نور کی تفہیم کے دو انداز

عدنان رحمٰن / ترجمہ: سید افتخار احمد

سورۃ النور میں آیات ۳۵ تا ۴۰ نے تاریخ اسلامی کے مختلف اَدوار میں نامور اہل علم کو دعوتِ فکر دی ہے۔ متقدمین میں امام غزالیؒ نے ان آیات کی تشریح و توضیح میں ایک پوری تصنیف ''مشکوٰۃ الانوار'' کے نام سے تحریر کی' جس کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے اور ایچ ٹی گیرڈنر نے غالباً پہلی بار انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔ جناب محمد عدنان ہارون رحمٰن کی گریجویشن سطح کی تعلیم کمپیوٹر سائنس میں امریکہ میں ہوئی جہاں وہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دروس قرآنیہ کے ذریعے فکر اسلامی اور تجدید و احیائے اسلام سے روشناس ہوئے۔ بعدازاں وہ کچھ عرصہ لاہور آ کر قرآن اکیڈمی میں سکالر کی حیثیت سے متعلق رہے اور بالخصوص شعبہ انگریزی کے تحت انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے چند کتابچوں کے انگریزی میں ترجمے کیے جو انجمن خدام القرآن نے شائع کیے ہیں۔ عدنان رحمٰن کی علمی پیاس انہیں کشاں کشاں ملائشیا کی اسلامی یونیورسٹی لے گئی جہاں انہوں نے ڈاکٹر سید نقیب العطاس کے انسٹی ٹیوٹ سے ایم اے کی ڈگری لی۔ اور اب موصوف مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ میں مقیم ہیں۔ مضمون ہٰذا انہوں نے انگریزی میں لکھا اور وہیں IONA کے سہ ماہی پرچے SIGNS میں شائع ہوا۔ ہم اس کا اردو ترجمہ قارئین حکمت قرآن کی خدمت میں اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ مصنف نے اسے محولہ بالا آیاتِ سورۃ نور کی تشریح کے دو انداز کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ترجمے میں قصداً فلسفے کی فنی اصطلاحات سے گریز کر کے اسے زیادہ سے زیادہ عام فہم بنایا گیا ہے۔ قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امام غزالیؒ کے فکر میں یونانی نوفلاطونی تنزلات کے افکار کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ غالباً غزالیؒ فلسفہ و فکر عقلی کا رد کرنے کے باوجود اس کے چنگل سے نہ بچ نکل سکے (کم از کم مشکوٰۃ الانوار کے مشمولات کی حد تک)' جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تفسیر و تشریح جمہور مفسرین کے مطابق قرآن و احادیث نبویہ کے محکمات پر مبنی ہے۔ اُمید ہے قارئین اس مضمون کو ایک سکالر کی کاوش کی حیثیت سے کھلے دل کے ساتھ پڑھیں گے۔ (ابصار احمد)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ط اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ

شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ لا یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط

وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳۵﴾ .... ﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ط

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا وَّوَجَدَ اللّٰہَ عِنْدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ ط وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾ اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰىہُ مَوْجٌ

مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ سَحَابٌ ط ظُلُمٰتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ ط اِذَآ اَخْرَجَ یَدَہٗ لَمْ یَکَدْ یَرٰىھَا ط وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ

نُّوْرٍ ﴿۴۰﴾﴾

''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو' اس میں ایک چراغ ہو' چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہو اور وہ شیشہ ایک چمکدار ستارے کی مانند روشن ہو' وہ چراغ جلتا ہو ایک ایسے مبارک زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی' اس کا روغن بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہو' خواہ اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ یہ روشنی ہے روشنی پر۔ اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جانب جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے' اور اللہ تو سب کچھ جاننے والا ہے۔ (یعنی وہ ہر شے کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف ہے!)

..........اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے دشتِ بے آب میں سراب (یعنی دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت) جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی' البتہ اللہ کو اپنے پاس موجود پاتا ہے جو اُس کا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے۔ اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔ یا اُن اندھیروں کے مانند جو کسی گہرے سمندر میں ہوں جنہیں ڈھانپے ہوئے ہو موج اور اس کے اوپر ایک اور موج اور اس پر (سایہ کیے) ہوں بادل۔ (گویا) تاریکیاں ہیں تہہ بر تہہ۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اور جسے اللہ ہی روشنی عطا نہ فرمائے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں!''

اللہ تعالیٰ کا ہر لفظ روشنی کی ایک شعاع ہے جس کی قوسِ قزح میں لامحدود رنگ پوشیدہ ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّىْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴿١٠٩﴾﴾ (الکھف)

''کہہ دیجیے اگر سمندر سیاہی بن جائے میرے پروردگار کی باتوں کے واسطے تو سمندر لازماً خشک ہو جائے پیشتر اس کے کہ میرے رب کی باتیں پوری ہوں اگرچہ اس کی مدد کو ہم ایک اور سمندر اسی طرح کا لے آئیں۔''

اسی وجہ سے مسلمان صوفیاء نے قرآن مجید کے ایک ہی ٹکڑے کی بے شمار توضیحات پیش کی ہیں۔ ہر ایک وضاحت لفظِ الٰہیہ کے سمجھنے کے لیے اس کے مخفی لامحدود طریقوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف علماء نے کلامِ الٰہی کے ایک ہی لفظ سے مختلف بصائر حاصل کیے ہیں۔ اور یہ ہر شخص کی ذہنی استعداد کے مطابق ہے جو اس کی تعلیمی حالت' خاندانی پرورش' ثقافتی ماحول' عمر کے مطابق تجربہ' ذاتی مزاج' بلکہ گروہی اثر' مختصر یہ کہ انسان کی پوری زندگی کے تجربات کے نچوڑ پر منحصر ہے۔

اب ہم قرآن مجید کی مشہور آیت النور کی دو مختلف توضیحات کا جائزہ لیں گے۔ ساتھ ہی سورۃ النور کی ۳۵ تا ۴۰ آیات کا بھی بیان ہوگا۔ یہ دونوں توضیحات تاریخ کے دو مختلف اَدوار کے عالموں کی ہیں جو ایک دوسرے کے قریباً ایک ہزار سال کے فرق سے پیدا ہوئے۔ نتیجتاً دونوں مختلف ماحول و حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک ہیں ابو حامد الغزالیؒ اور دوسرے ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ۔

ابو حامد الغزالیؒ کی توضیح

الغزالیؒ (۴۵۰ھ/۱۰۴۸ء تا ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) طوس' خراسان موجودہ ایران میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے وقت کے تمام سائنسی مضامین' فقہ اسلامی' تصوف اور یونانی فلسفہ پر عبور حاصل کیا۔ تصوف اور یونانی فلسفہ میں ایک نظریہ مشترک ہے کہ ہر چیز کا ایک باطنی پہلو بھی ہے جو صرف ان حضرات کے علم میں آتا ہے جو اس راہ پر گامزن ہوں اور عوام الناس سے مختلف ہوں' یعنی یونانی فلاسفر اور مسلم صوفی۔ الغزالیؒ زیادہ تر فلاسفی پر اعتراض کے لیے مشہور ہیں' حالانکہ ان کے اپنے خیالات پر یونانی فلاسفی کا خاصا اثر ہے جو اُن کے مذہبی نقطۂ نظر سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً الغزالی کی آیت النور کی تفسیر کو ہی لے لیں کہ وہ کس طرح یونانی فلاسفی کے عناصر کو اپنے خیالات کے ساتھ ملاتے ہیں اور اکثر و بیشتر وہ اس کا حوالہ بھی نہیں دیتے۔ زیر بحث عالمانہ خطبہ ان کی کتاب ''مشکوٰۃ الانوار'' میں ہے۔ یہ کتاب عربی سے انگریزی میں ولیم گیرڈنر نے The Niche of Lights کے نام سے ترجمہ کی ہے جو ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ لندن سے شائع ہوئی۔

اس کے مطابق الغزالی نور کے فہم کے اعتبار سے انسانوں کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں:

(۱) ''نور'' عوام کی سمجھ کے مطابق۔

(۲) ''نور'' خواص کی سمجھ کے مطابق۔

(۳) ''نور'' اخص الخواص کی سمجھ کے مطابق۔

عوام جن میں کہ سمجھنے کی صلاحیت زیادہ نہیں ہوتی' وہ ظاہری چیزوں کے علاوہ ان کی باطنی حقیقت کو بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے لیے نور ایک مادی مظہر ہے جس میں چیزیں ظاہر نظر آتی ہیں' حالانکہ بینائی ایک موضوعی عمل ہے جو ہر شخص اور ماحول کے مطابق مختلف ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایک شخص کو ایک چیز نظر آ رہی ہو اور دوسرے کو وہ نظر نہ آ رہی ہو۔ اس طرح ایک شخص دیکھ سکتا ہے اور دوسرا (نابینا) روشنی کی موجودگی میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ بصارتی ملکہ کے تحت تمام چیزیں تین درجوں میں آتی ہیں:

(۱) جوخودبخود (بالذات) نظر نہ آئیں۔ان پر روشنی پڑے تو نظر آئیں‘ مثلاً پتھر۔

(۲) جوخود تو نظر آئیں‘ لیکن دوسری چیزوں کو روشن نہ کریں‘ مثلاً ستارے۔

(۳) جوخود بھی نظر آئیں اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کریں‘ مثلاً سورج۔

ان تین درجوں میں سے صرف تیسرا درجہ ایسا ہے کہ ان اشیاء کو روشنی (نور) کہا جا سکتا ہے۔روشنی کا یہ وہ تصور ہے جس سے عوام واقف ہیں۔خواص کے نزدیک بصارت کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔روشنی اور دیکھنے کی حس‘ بلکہ دیکھنے کی حس زیادہ اہم ہے‘ کیونکہ اس سے چیزوں کا ظہور بھی ہوتا ہے اور ادراک بھی۔دوسری طرف روشنی بذاتِ خود کسی چیز کا فہم حاصل نہیں کرتی۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بصارت آنکھ میں ہے اور ’’روشنی‘‘ (بصارت یا نور) حقیقت میں ظاہری یا مجسم روشنی سے مختلف ہے۔روشنی کا یہ تصور خاص افراد کے نزدیک ہے۔اخص الخواص کا نظریہ یہ ہے کہ اگرچہ آنکھ یا بصارتی حس کا مجسم روشنی سے زیادہ موزوں نام ’’روح باصرہ‘‘ (نور) ہونا چاہیے‘ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آنکھ یا بصارت یا بصارتی حس میں ایک نقص ہے۔وہ یہ کہ یہ دوسروں کا تو مشاہدہ کر سکتی ہے مگر خود کو دیکھ نہیں سکتی۔یہ بہت دور کی چیز نہیں دیکھ سکتی۔نہ ہی یہ بہت چھوٹی چیز کو دیکھ سکتی ہے‘ اور نہ پردے کے پیچھے کی چیزوں کو اور نہ ہی چیزوں کے اندرونی حصے کو۔کبھی یہ مکمل چیز کی بجائے اس کے چند حصوں کو دیکھ سکتی ہے اور کبھی حصوں کی بجائے مکمل چیز کو دیکھ سکتی ہے۔یہ محدود چیزوں کو دیکھ سکتی ہے‘ لامحدود کو نہیں۔بڑی چیز اسے چھوٹی نظر آتی ہے۔جو دور ہے وہ نزدیک نظر آتی ہے۔جو کھڑی ہے وہ حرکت کرتی نظر آتی ہے اور جو حرکت کرتی ہے وہ کھڑی نظر آتی ہے۔تاہم ایک اور ’’آنکھ‘‘ ہے جو بغیر اِن نقائص کے دیکھ رہی ہے۔وہ آنکھ فہم وفراست (عقل‘ روح‘ نفس الانسانی) ہے جو مکمل اور غلطیوں سے پاک ہے‘ کیونکہ یہ چیزوں کی حقیقت کو دیکھتی ہے۔مثلاً آنکھ ایک لڑکے کے قد اور کاٹھ کو دیکھتی ہے جبکہ فہم وفراست دیکھتی ہے کہ وہ متواتر بڑھ رہا ہے۔تاہم فہم وفراست میں وہم وخیال کی وجہ سے دھندلکا ہو سکتا ہے۔القصہ مادی روشنی کی نسبت بصارت زیادہ ’’روشنی‘‘ کہلانے کی حق دار ہے‘ جبکہ فہم و فراست (بصیرت) اس سے بھی زیادہ مناسب ’’روشنی‘‘ (نور) کہلانے کی مستحق ہے۔

قرآن‘ فہم وفراست کا سورج

فہم وفراست سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ اس کی سمجھ کی متعدد شکلیں ہیں۔کچھ علم‘ فہم کے لیے ودیعت شدہ ہے‘ اس لیے فوراً ہی اس کا ادراک کر لیا جاتا ہے‘ جبکہ دوسرے کے لیے منطقی دلیل دینی پڑتی ہے۔اوّل الذکر کی مثال یہ قضیہ ہے کہ کوئی شے ایک ہی وقت میں موجود اور غیر موجود نہیں ہو سکتی۔الغزالی تحریر کرتے ہیں کہ ’’ایسے قضایا اور مسائل کے حل کے لیے فلاسفروں کے کلام کا فہم قیاسی کلیات کے سہارے سمجھنا ہو گا جس کے لیے تحریک اور مواد فلسفیانہ کلام سے ملتا ہے۔پس جب فلسفیانہ روشنی پھیلتی ہے تو آدمی وہ کچھ بالفعل دیکھتا ہے جو کہ پہلے پوشیدہ اور بالقوۃ دیکھا تھا‘‘۔

اس طرح اگر ایک چیز جس نے فہم کی غلطی کو درست کر کے اسے صحیح کر دیا تو یہ اس سے اعلیٰ روشنی ہو گی۔الغزالی کے مطابق ’’وحی‘‘ کا یہی کام ہے۔الہامی کتب اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے سب سے اعلیٰ فلاسفی ہے۔اور قرآن مجید جو آخری وحی ہے‘ اعلیٰ ترین فلاسفی ہے۔قرآن مجید کی آیات سورج کی شعاعوں کی مانند ہیں جن کے ذریعے ادراک وفہم کا عمل جاری ہوتا اور جلا پاتا ہے۔جس طرح سورج آنکھ کے لیے ہے اسی طرح قرآن فہم کے لیے ہے‘ لہٰذا قرآن مجید زیادہ اہل ہے کہ روشنی کہلائے۔بفحوائے آیتِ قرآنیہ:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ط﴾ (التغابن:۸)

’’پس ایمان لاؤ اللہ پر‘ اس کے رسولؐ پر اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا‘‘۔

اس طرح سورج دو ہیں۔ایک طبعی سورج جس کا تعلق عالمِ محسوسات ومشاہدہ سے ہے۔’’عالم الحس والمشاھدۃ‘‘ جو ظاہری روشنی پھیلاتا ہے اور خارجی بصارت دیتا ہے۔اور دوسرا سورج قرآن جس کا تعلق عالمِ آخرۃ سے ہے‘ یعنی ’’عالم ملکوت‘‘ جو باطنی روشنی پیدا کرتا ہے اور فہم وفراست (بصیرت) کو پیدا کرنے میں ممد ہوتا ہے۔

زمینی اور ملکوتی روشنی کا تدریجی نظام

طبعی بصارت کا ایک نقص یہ ہے کہ آنکھ جب دیکھتی ہے تو وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔اس کے برعکس فہم جب دیکھ رہا ہو تو وہ نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود کو بھی دیکھتا ہے۔اور جو چیز ان دو عملوں سے اوپر ہو، وہ دوسروں کو بھی روشن کرتی ہو تو وہ اس سے بھی اوپر درجہ رکھتی ہے، اور وہ ہے ''ماورائی نبویؐ روح'' (الروح القدسی النبویؐ)۔روشن کرنے والا چراغ (سراج منیر) جو دوسروں پر نور پھیلاتا اور انہیں چمکاتا ہے۔''نبوی روح'' صرف نبیوں میں ہوتی ہے یا اولیاء اللہ میں۔اور اس سے انسانیت کو غیب کی تختیاں پڑھائی جاتی ہیں (لوائح الغیب)۔دوسری دنیا (آخرت) کے اصول (احکام الآخرۃ) زمینی وملکوتی میدان کے عارفانہ حقائق (معارف ملکوت السمٰوٰت والارض)۔اور دینی سائنس (المعارف الربانیۃ)۔اگر رسولوں کو چراغوں سے تشبیہہ دی جائے تب جو چیز چراغ کو روشن کرتی ہے اس کی جانب آگ سے اشارہ کرنا زیادہ لائق ہے۔اور یہ فرشتوں کی مانند ہے جو رسولوں کے پاس وحی لاتے ہیں اور انہیں روشن کرتے ہیں۔اس طرح تمام رسول زمینی چراغ کا کردار ادا کرتے ہیں جو ملکوتی چراغوں ملائکہ (فرشتوں) سے منور ہیں۔اس طرح ملائکہ سے نبی کے منور ہونے کو ''نور پر نور'' کہتے ہیں۔﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ﴾ (النور ۳۵)۔

زمینی چراغ (رسول) دراصل انوار علیا سے نور حاصل کرتے ہیں۔اور خود ملائکہ ایسے ملکوتی نظام میں ہیں کہ ان میں سے اعلیٰ ترین (جبرائیلؑ) ہمہ وقت لامحدود نور کے قرب میں رہتا ہے: ﴿وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿١٦٤﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿١٦٥﴾﴾ (الصّٰفّٰت) ''ہم میں سے ہر ایک کی جگہ مقرر ہے اور ہم تو (بندگیٔ الٰہی میں) صف بستہ کھڑے ہیں''۔

اخص الخواص کا تصور

ملکوتی روشنیاں یا چراغ بے شمار ہیں۔ہر نیچے والا اوپر والے سے منور ہوا۔ان کا یہ نظام نتیجتاً بلند ترین درجے یعنی ''نور الانوار'' تک پہنچتا ہے، جو تمام روشنیاں پھیلاتا ہے اور اس کی روشنی اپنی ذاتی ہے۔انتہائی روشنی (نور) اللہ تعالیٰ کی ہے۔پس الغزالی لکھتے ہیں کہ جس طرح ہر چیز روشنی کی وجہ سے آدمی کی نظر میں آتی ہے اسی طرح ہر چیز اللہ تعالیٰ کی وجہ سے آدمی کی باطنی نگاہ میں آتی ہے، کیونکہ وہ (اللہ تعالیٰ) ہر وقت ہر چیز کے ساتھ ہے اور اسی وجہ سے ہر چیز ظاہر ہوتی ہے۔اس طرح آیت النور کے پہلے جزء ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' (النور ۳۵) کی تشریح کی جاسکتی ہے۔یہ ہے روشنی کا وہ تصور جو اخص الخواص نے سمجھا ہے، جس میں رسول اور اولیاء شامل ہیں۔

غزالیؒ کے متذکرہ بالا خیالات کو جمع کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ دُنیوی اور ملکوتی چراغوں کی روشنی ہے۔مندرجہ بالا توضیح سے پوری طرح یہ واضح نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بطور نور اور مخلوق میں کس طرح کا رشتہ ہے؟ یا کیا تعلق ہے؟ الغزالی لکھتے ہیں کہ روشنی کا مطلب ہے ''ظاہر ہونا یا نمایاں ہونا۔'' اس لیے جو دوسروں پر ظاہر نہ ہو وہ اندھیرا ہے۔اگرچہ وہ موجود ہے لیکن اس کی موجودگی دوسروں پر ظاہر نہیں ہے۔اس کا مطلب ہے کہ مطلق ظلمت نیستی ہے، کیونکہ نیستی نہ دوسروں پر ظاہر ہے اور نہ بذات خود موجود ہے۔پس اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر نیستی ظلمت ہے تو ہستی (وجود) روشنی ہے۔

ہستی دو قسم کی ہے۔ایک وہ جس کا وجود ذاتی ہو۔ثانیاً جس کا وجود غیر سے مستعار ہو۔یہ دوسری قسم دراصل حقیقی وجود نہیں رکھتی۔حقیقی ہستی صرف وہ ہے جو بذات خود ہو بغیر کسی کی مدد کے۔ایسی ہستی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ پر منحصر ہے۔اس طرح الغزالی سمجھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور یہ اس کے مترادف ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی اصل وجودی حقیقت ہے۔

الغزالی اچھی طرح جانتے تھے کہ اس تشریح پر ''ہمہ اوست'' کا اعتراض ہوسکتا ہے، کیونکہ الغزالی کی توضیح کا مطلب ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ ہے۔اگر ایسا ہے تو پھر پوچھا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس کی مخلوق سے کیا تعلق ہے؟ علاوہ ازیں الغزالی کے بیان کے مطابق کہ ''وہ ہر لمحہ ہر چیز کے ساتھ ہے اور ہر چیز اسی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے'' اس سے کوئی کیا سمجھے گا؟ الغزالی اس کا جواب دو تمثیلوں کی مدد سے دیتے ہیں۔اوّلاً وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم سورج کی روشنی میں چیزیں دیکھتے ہیں تو ہم سورج کی روشنی نہیں دیکھتے بلکہ چیزیں اور سورج دیکھتے ہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو جب دیکھتے ہیں تو صرف مخلوق کو دیکھتے ہیں نہ کہ اللہ کے وجود کا اثر مخلوق پر۔دوسری مثال الغزالی یہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم کوئی مظہر مثلاً رنگ دیکھتے ہیں تو صرف رنگ دیکھتے ہیں، اس کے گرد کچھ اور چیز نہیں، حالانکہ رنگ بغیر روشنی کے کچھ نہیں ہے، کیونکہ یہ صرف روشنی ہے جس سے ہم رنگ دیکھ سکتے ہیں۔یہ عمل روزمرہ زندگی میں ہوتا ہے کہ ہم رنگ دیکھتے ہیں، روشنی نہیں۔یہ غالباً روشنی کی ازبس ظاہریت اور رنگ کے ساتھ شدت سے ملنے کی وجہ سے ہے۔اس سے زیادہ روشنی شاید اپنی شدت کی وجہ سے نظر نہیں آتی، کیونکہ چیزیں جو ایک حد پر پہنچ جاتی ہیں وہ دوسری طرف کی حد پر چلی جاتی

ہیں۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چیزیں جو ظہور کی آخری حد پر ہوتی ہیں نہ دکھائی دینے والی (مخفی) بن جاتی ہیں۔عربی کا مقولہ ہے کہ تُعرفُ الاشیاءُ باضدادھا یعنی چیزیں اچھی طرح اس وقت سمجھی جا سکتی ہیں جب ان کا مقابلہ ان کی مخالف چیزوں سے ہو۔لہٰذا وہ چیز جس کا نہ کچھ مخالف ہو نہ مقابل' وہ ہمیشہ ایک جیسی نظر آنے والی ہو' تو جب آپ اس کو دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ آپ کے ذہن پر اثر انداز ہونے سے رہ جائے' یعنی آپ کے نوٹس میں نہ آئے۔اندریں صورت اس کا نامعلوم یا ناقابل مشاہدہ ہونا اس کے ازحد عیاں ہونے کا نتیجہ ہے اور اس کی انتہائی تابنا کی نگاہوں سے پوشیدگی کا باعث بنتی ہے۔

آیۃ النور کی رمزیت اور انسانی روح کے پانچ قویٰ

اب ہم آیۃ النور میں بیان کیے گئے چھ تمثیلی الفاظ کا الغزالی کی تفسیر میں ذکر کریں گے۔طاق' چراغ' لیمپ کے گرد شیشے کا گھیرا یا چمنی' ستارہ' درخت (زیتون)' تیل (زیت)۔الغزالی ان کو روح کے قویٰ سے تعبیر کرتے ہیں۔روحانی حسوں یا قویٰ کے نظام کا اصول سب سے پہلے یونانی فلاسفی میں ارسطو (۳۸۴۔۳۴۴ق م) نے بیان کیا' جسے فارابی (۸۷۰۔۹۵۰م) اور ابن سینا (۹۸۰۔۱۰۳۷م) نے اسلامی لبادہ پہنایا۔مؤخر الذکر دو مفکرین کے خیالات الغزالی کے فکر کا ماخذ ہیں اور انہوں نے بہت سے افکار ان سے مستعار لیے ہیں۔

مشکوٰۃ روح الحساس: یہ وہ قوت ہے جس کے ذریعے حسّی معلومات کی آمد ہوتی ہے۔یہ جسمانی آنکھ' زبان' ناک' کان وغیرہ سے مواد وصول کر کے روح الحساس کو دیتی ہے جو حیوانی جان کی جڑ اور اصل ہے۔یہی انسان میں بھی فطری طور پر موجود ہے۔

زجاجہ روح الخیالی: یہ وہ قوت ہے جس کے ذریعے معلومات کو جمع کرنے اور دوبارہ یادداشت کے لیے ڈیٹا روح الحساس کو پہنچایا جاتا ہے۔یہ ڈیٹا کے ضائع ہونے سے حفاظت کرتا ہے اور استعمال کے لیے بالائی سطح کے قویٰ کو پیش کرتا ہے۔یہ انسان میں فطرتاً موجود نہیں ہے' مگر وقت اور تجربات کے ساتھ پیدا ہوتا اور بڑھتا رہتا ہے۔

زیت روح العقلی: یہ وہ قوت ہے جو زیادہ تر ذہنی یا تجریدی سطح پر کام کرتی ہے' کیونکہ یہ تصور اور سمجھ کی سطح سے اوپر اٹھتی ہے۔اس کے کام کا میدان زیادہ تر اولیات اور بدیہیات (سچائی وغیرہ) ہے' مثلاً کوئی شے بروقت موجود اور غیر موجود نہیں ہو سکتی۔یہ صلاحیت انسانوں کے لیے ہی خاص ہے مگر اکتسابی ہے۔اسے تیل سے تشبیہہ دے سکتے ہیں' کیونکہ یہ دوسری اعلیٰ تر حسوں کے لیے ایندھن کا کام دیتی ہے۔

شجرہ (زیتون کا درخت) روح الفکری: یہ حاسہ منطقی دلائل سے بحث کرتا ہے۔اس کا مقصد مختلف قضایا یا مسلّمات کو دیکھنا اور ان سے ان کے نتائج برآمد کرنا ہے۔برآمد شدہ نتائج خود بخود اگلے غور و فکر کے لیے مواد بن جاتے ہیں۔اس فکری جانچ پرکھ کے قضایا کا ملانا اور نتائج کا نکالنا ہمیشہ جاری رہتا ہے۔اس کا مناسب ترین نشان درخت کا ہے جس کی شاخیں سب طرف پھیل جاتی ہیں جس طرح منطقی دلائل اور ان کے تضمنات۔اس آیت میں زیتون کے تیل کی مثال دی گئی ہے' کیونکہ اس آیت میں دراصل اس کے تیل کا ذکر ہے جو روشنی کو شدید کرتا ہے' اسی لیے اسے برکت والا درخت کہا گیا ہے۔یہ تیل چراغوں کو روشن کرتا ہے۔جس طرح مختلف مسائل کی شاخیں' پھر وہ نتائج بنتی ہیں' اور نتائج عقلی ہونے کی نسبت سے ایک ٹھوس چیز بن جاتے ہیں جو نہ اِدھر ہوتے ہیں نہ اُدھر۔اسی لیے یہ درخت نہ مشرق کی طرف کا نہ مغرب کی طرف کا ﴿لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ کہلاتا ہے۔

ماورائی روح النبویؐ (الروح القدسی النبویؐ) کے متعلق امام الغزالی کا نظریہ اب بیان کیا جا سکتا ہے۔یہ روح انبیاء اور اولیاء میں موجود ہوتی ہے۔جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کچھ علوم انسان میں فطرتاً موجود ہوتے ہیں' جبکہ دوسری قسمیں اکتساب اور نشوونما چاہتی ہیں۔اس نشوونما کے عمل کا کچھ حصہ ذاتی ترقی کا آئینہ دار ہے' جبکہ بقیہ خارج سے ملتا ہے۔یہ دوسری قسم کا حصہ کچھ لوگوں کے لیے ایسی اونچی سطح پر پہنچ جاتا ہے کہ اولیاء کی روشنی تقریباً اس سے بے نیاز ہو جاتی ہے جو انہیں پیغمبر عطا کرتے ہیں اور پیغمبروں کے لیے وہ روشنی فرشتوں کی عطا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔لہٰذا آیت کے الفاظ کی اس صورت حال کی ترجمانی انتہائی موزوں ہے کہ جس کے تیل کا بھڑکیلا پن روشنی کے اتنا نزدیک ہوتا ہے حالانکہ ابھی آگ نے اسے چھوا بھی نہیں ہوتا۔

﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط﴾ ''روشنی پر روشنی'' کے جملہ کی ایک توضیح اس طرح سمجھ آتی ہے کہ وحی الٰہی کی روشنی کا فرشتوں کی روشنی کے منبع سے گزر کر پیغمبر کی روح پر نزول ہونا۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ روشنیوں کی شعائیں انسانی روح پر روشنی کی پہلی حسی روشنی سے لے کر نبوی روح کی روشنی تک ایک تدریجی تسلسل کا نزول ہیں۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم اسی طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

ظلمت اور اس کے درجات کا بیان

مشکوٰۃ الانوار میں الغزالی چالیسویں آیت کی تشریح کرتے ہیں۔ اس آیت کے مطابق الغزالی کا خیال ہے کہ روشنی ہدایت کا ایک نشان ہے' جبکہ اندھیرا گمراہی کا نشان ہے۔ جس طرح ایک آدمی ہدایت کی روشنی کے مختلف درجات سے ہدایت حاصل کرتا ہے' اسی طرح وہ گمراہیوں کی ظلمت کی تہوں تلے ڈھانپا ہوا ہوتا ہے۔ آیت اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتی ہے: ''کسی اتھاہ گہرے سمندر میں' جہاں موج پر موج چھائی ہوئی ہو' اس پر گہرے بادل چھائے ہوں' اندھیرے پر اندھیرے' گہرے اندھیرے''۔ الغزالی اتھاہ گہرے سمندر کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے یہ دنیا جس میں مہلک خطرات' شیطانی حوادث اور اندھا کرنے والی تکالیف ہیں۔ اس اتھاہ گہرے سمندر میں پہلی موج کو شہوت کہتے ہیں جو تمام سفلی جذبات کی جڑ ہے۔ دوسری موج غیر اخلاقی خاصیتیں ہیں' مثلاً غصہ' نفرت' بغض' تکبر' اور بھڑک اٹھنا وغیرہ۔ اس پر بادل' منفی عقلی رویے ظاہر کرتے ہیں' مثلاً خبیث اور فاسد خیالات۔ جیسا کہ بادل کا کام روشنی کو روکنا ہے یہ ''ذہنی بادل'' چمکتی ہوئی روشنیوں کو روک دیتے ہیں' قرآن مجید اور پیغمبر کی ہدایت کو بھی' خواہ وہ کتنی ہی قریب ہوں۔ یہ آیت ایسے گمراہ لوگوں کو یوں ظاہر کرتی ہے: ''اگر ایک آدمی ایسے میں اپنا ہاتھ بڑھائے تو وہ اسے نہ دیکھ سکے''۔ آخری تجزیے میں یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ روشن کرے ایمان کے ساتھ جس کے دل کو چاہے' کیونکہ جسے اللہ روشنی نہ دے اس کے لیے کوئی روشنی نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی توضیح

ڈاکٹر اسرار احمد ۱۹۳۲ء میں ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری سے متاثر تھے۔ بعد میں ان کی فلاسفی کے بھی قائل ہوئے۔ اقبال کی فلاسفی نے قدرے جدید یورپی فلاسفی سے جوش و ولولہ حاصل کیا' اسی لیے شعوری طور پر انہوں نے یونانی فلسفے کو رد کیا جسے قدیم مسلمانوں نے اختیار کر لیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خیالات پر دوسری چھاپ جنوبی ایشیا کے دیوبندی مدرسہ کی تھی۔ اس مدرسہ کے مطابق صوفیانہ سلسلہ قائم رکھتے ہوئے اس کی وحدت الوجود کی توضیح ''ہمہ اوست'' پر اعتراض کیا جاتا تھا' جس وجہ سے ڈاکٹر صاحب پر یونانی فلسفہ اثر انداز نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ الغزالی کی آیت النور کی تفسیر ''ہمہ اوست'' کے تحت ڈاکٹر صاحب نے قبول نہیں کی بلکہ اس کے برعکس روشنی کو مخلوق اور وجودی کہا جو اللہ تعالیٰ سے مختلف چیز ہے۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب کو ان کے سائنسی اور میڈیکل سائنس کے پس منظر کی نسبت سے جدید فزیکل سائنسز کی مبادیات اور منہاج کو سمجھنے میں مدد ملی اور انہیں مذہب کی تفہیم میں ان کی افادیت کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اب ہم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی پیش کردہ آیۃ النور کی تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

روشنی کی ماہیت

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب برخلاف امام غزالیؒ کے روشنی کو مادی حقیقت یا زمانی مظہر تصور کرتے ہیں' لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ان کے اپنے دلائل ہیں۔ آیاتِ قرآنیہ کے الفاظ کی تحلیل کی جائے تو ''نُـوْرِہٖ'' کا مطلب ہے اُس (اللہ تعالیٰ) کا نور یا اُس (اللہ تعالیٰ) کی روشنی۔ چنانچہ اس میں اضافیت کا مفہوم ہے۔ گویا اس طرح کہا جائے ''میرا قلم''۔ یقیناً ''میرا قلم'' ''میری ذات اور میرے تشخص'' سے مختلف ہے' اگرچہ ان دونوں کی نسبت مجھ سے ہے۔ اس لیے نُـوْرِہٖ کو اس اضافی ملکیتی اثر کے تحت سمجھنا چاہیے۔ حتمی دلیل کے طور پر ڈاکٹر اسرار ایک اور مثال دیتے ہیں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط﴾ ''تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیے اور اندھیرا اور اجالا بنایا''۔ (الانعام:۱)

یہ بلاشبہ ظاہر کرتا ہے کہ ''روشنی یا نور'' جو مخلوق ہے خالق کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب روشنی کو ایسی مادی چیز خیال کرتے ہیں جس سے ہمارے اردگرد کا ماحول روشن ہوتا ہے اور ہم اس میں چیزیں دیکھ سکتے ہیں' یعنی اس کا تعلق ہماری ''خارجی بصارت'' سے ہے۔ اسی طرح ہماری اندرونی روشنی جسے ہم ''بصیرت'' کہتے ہیں' کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے جس سے ہم اپنی اندرونی اشیاء یعنی مظاہر کے پس پردہ ''پوشیدہ حقائق'' کو دیکھتے ہیں۔ یہ وہ پوشیدہ حقیقت ہے جس کا حضور ﷺ نے اپنی دعا میں اشارہ کیا

ہے۔ ”اے اللہ مجھے چیزوں کی اس حقیقت سے آگاہ فرما جس طرح کہ وہ ہیں“۔ یہ باطنی روشنی دراصل اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ یا دوسرے معنوں میں ایمان جیسا کہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط﴾ (البقرۃ:۲۵۷) ”اللہ ان کا دوست ہے جو ایمان رکھتے ہیں، وہ انہیں ظلمت کی گہرائیوں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے“۔ پس وہ لوگ جو ایمان کی داخلی روشنی رکھتے ہیں کُل حقیقت ان پر عیاں ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق ایمان کا موضوع اور فلسفہ کا موضوع اپنی جامعیت میں ایک ہی ہے۔ صاحب ایمان ہونے کا مطلب ہے: اشیاء کی حقیقت جاننا جس طرح وہ فی الحقیقت ہیں۔

ایمان کے لیے ایک مفصل مثال

آیت نور پر ڈاکٹر صاحب اپنی تفسیری رائے کی بنیاد حضرت اُبی بن کعبؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اقوال پر رکھتے ہیں۔ حضرت اُبی بن کعبؓ کی روایت کے مطابق الفاظِ قرآنی ”مَثَلُ نُوْرِهٖ“ (مثال اس کے نور کی) سے مراد مَثَلُ نُوْرِ مَنْ اٰمَنَ (مثال اس کی روشنی/نور کی جو ایمان لایا ہے) جبکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے میں ان الفاظ قرآنیہ کا مفہوم یا مدلول مَثَلُ نُوْرِهٖ فِيْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ (اس کے نور کی مثال قلب مؤمن میں) ہے۔ ان دونوں آراء سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ ایمان کا مسکن قلب ہے، بفحوائے آیات قرآنیہ: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات:۷) ”لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لیے پسندیدہ بنا دیا ہے اور تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے“ اور: ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ط﴾ (الحجرات:۱۴) ”اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے“۔

جسمانی مثال

ڈاکٹر صاحب آیۃ النور کی روشنی کی مثال مؤمن کے دل میں ایمان سے دیتے ہیں۔ وہ اس آیت کی وسیع تر موافقت میں انسانی جسمانی ساخت کو بطورِ مثال پیش کرتے ہیں۔ اس پہلو سے طاق کی مثال ان پسلیوں سے دی جاتی ہے جو دل کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ اگر دل ایمان کی روشنی سے منور ہو جائے تو یہ چمکدار لیمپ کی طرح چمکتا ہے۔ زجاج (چمنی) کا مقصد شعلے کو ہوا سے بچانا ہے تاکہ لیمپ کی روشنی سب طرف ایک جیسی منعکس ہو اور یکساں اعتبار سے ماحول کو منور کرے۔ اب ”دل“ کا لفظ خالص جسمانی ساخت کے لیے سمجھ لیں یا روحانی اصطلاح میں۔ پہلی اصطلاح میں دل ایک عضلاتی پمپ ہے جو چھاتی کے گھیرے میں موجود ہے۔ پسلیاں اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ دوسری اصطلاح کے مطابق دل فہم و فراست اور معرفت کی ایک قوت ہے جس سے چیزوں کی حقیقت اس طرح معلوم ہوتی ہے جیسے کہ وہ ہیں۔ انسانی روح میں یہ ایک نہایت اہم قوت ہے جو حقیقی دانشمندی کی علامت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق یہ دونوں انداز یعنی جسمانی اور روحانی ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ نتیجتاً انہوں نے ”طاق میں چراغ“ کو ”پسلیوں کے پنجرہ میں دل“ کی عمدہ مثال سے واضح کیا۔ لیکن پھر وہ اس چراغ کی روشنی اور اس میں جلنے والے تیل کو مذہبی اور روحانی الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان کے خیال کے مطابق قلب روحانی، جسمانی دل نہیں ہے۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ یہ منہج فکر روحانی اور مادی دونوں صورتوں کو نہ صرف اہمیت دیتا ہے بلکہ انہیں ایک وحدت میں پروتا ہے۔

قرآن مجید میں بیان کردہ زیتون کے درخت کے بارے میں عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ یہ میدان میں اکیلا ہے یا کسی پہاڑی کی چوٹی پر۔ ایسا اکیلا درخت سورج کی روشنی یا حرارت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ ﴿لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ یعنی ”نہ شرقی نہ غربی“ کا یہی مطلب ہے۔ ایسے درخت کا تیل نہایت خالص ہوتا ہے جو بھڑک اٹھنے اور روشن ہونے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کے تصور کا مصداق گیسولین ہوگا جو پٹرولیم سے بنتا ہے اور نہایت بھڑکیلا اور بخارات بن کر اڑنے والا ہے۔ چونکہ گیسولین بہت جلد آگ پکڑ لیتا ہے اس لیے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ بھڑکنے کے لیے بے تاب ہے۔ خالص، صاف ستھرے زیتون کی بھی یہی خاصیت ہے جو قرآن مجید نے بیان کی ہے کہ بھڑک اٹھنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے پیشتر اس کے کہ آگ اس کو چھوئے۔ قرآن کریم نے ایمان کی وضاحت جو لیمپ میں جلنے والے زیتون کے تیل سے کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کے دو حصے ہیں۔ تیل میں جلنے کی صلاحیت ہے، لیکن اس کو جلانے کے لیے بیرونی عنصر آگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایمان کی روشنی اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب فطرت کی روشنی اور وحی کی روشنی دونوں باہم مل جاتی ہیں۔

دوہری مثال: روشنی پر روشنی (نورٌ علٰی نورٍ)

زیتون کا تیل راست، اصلی وقدیمی اور غیر مسخ شدہ، انسانی فطرت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو لوگ اپنی خلقی فطرت کو فضول خواہشات، لذات اور جاہلانہ رسومات سے محفوظ رکھتے ہیں وہ فوراً اور دل کی گہرائی سے وحی الٰہی کو قبول کرنے کی فطری پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ وحی کی پکار اور وحی کی حقیقت پر، جو ان کے اندر پہلے سے موجود ہوتی ہے، ذرا نہیں جھجکتے۔ ان کی اندرونی فطری روشنی اور بیرونی وحی کی روشنی مل کر آیت النور کے مطابق نورٌ علٰی نورٍ (روشنی پر روشنی) بن جاتی ہے۔ اس کا اظہار اس دعا میں بھی ہے کہ جب بندۂ مؤمن پکارے گا، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ق﴾ (آل عمران: ۱۹۳) ”اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ہمیں دعوت دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، پس ہم ایمان لے آئے......“

کفر کی مثال بصورت ظلمت (اندھیرا)

سورۃ النور کی آیت ۳۹ و ۴۰ میں کفر کا بیان ہے جو ایمان کی ضد ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جس طرح ایمان کی دو صورتیں ہیں، ایک ظاہری (زبانی اقرار) اور دوسری باطنی (قلبی یقین) اسی طرح کفر کی بھی دو صورتیں ہیں، یعنی اس میں بھی ایک ظاہری حالت (قانونی کفر) ہے اور دوسری باطنی حالت (حقیقی کفر)۔ اسلام کا زبانی اقرار (اقرارٌ باللسان) ایک ظاہری اور قانونی حالت ہے، کیونکہ اقرار کرنے والا مسلم قوم کا ممبر بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایمانی حقائق کا زبانی انکار کرنے والا قانونی طور پر مسلم قوم سے الگ آدمی ہے۔ اس کے برعکس ایمان کا قلبی یقین یا انکار قانونی حالت نہیں ہے بلکہ وہ ایسی تجرباتی حقیقت ہے جو کسی کے دل کی سیماب وش کیفیت کا مظہر ہے۔ جبکہ قانونی درجہ میں ایمان اور کفر دونوں کا ”ہے یا نہیں“ کے اعتبار سے فیصلہ کیا جائے گا (یعنی کوئی یا تو مسلم ہے یا کافر) لیکن دل کے معاملہ میں ایمان یا کفر صرف ”بڑھنے یا گھٹنے“ (کم یا زیادہ) کی حالت میں ہو سکتے ہیں۔

سورۃ النور کی آیت ۳۹ اور ۴۰ میں قلبی کفر کی بات ہے جو ظاہری اور قانونی اسلام کے ساتھ موجود ہو سکتا ہے۔ ہمیں ان مثالوں کو سنجیدگی سے سمجھنا چاہیے، کیونکہ یہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے ہو سکتی ہیں۔

کفر کس طرح ”اعمالِ صالحہ“ کو مٹاتا ہے

آیت ۳۹ کی مثال ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو سچائی یعنی ایمانی حقائق کو تسلیم نہیں کرتے اور انکار کا رویہ اختیار کرتے ہیں، لیکن بزعمِ خویش ”نیکیوں“ کا ڈھیر جمع کرتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے یتیم خانے، مدرسے، ہسپتال بنائے ہیں یا دوسرے خیراتی کاموں کے لیے رقمیں مختص کی ہیں۔ چونکہ وہ کام اللہ کے لیے نہیں کیے گئے بلکہ کسی اور مقصد کے تحت کیے گئے، لہٰذا یہ سب ”اعمالِ صالحہ“ قیامت کے دن راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے اور ان کا میزانِ خداوندی میں کوئی وزن نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک نیک اعمال کا شمار باطنی حقیقت کے مطابق ہے نہ کہ مزعومہ خواہشات یا ظاہری شکل کے مطابق۔ قرآن مجید میں یہ سچائی اس طرح بیان کی گئی ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ج وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ لا وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾﴾

”نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو، بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور یومِ آخر پر، اور فرشتوں پر، اور کتابوں پر اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو، اور یتیموں کو، اور محتاجوں کو، اور مسافر کو، اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کر لیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں، تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعتاً راست باز ہیں، اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً متقی ہیں۔“

یہاں سراب کی مثال بہت ہی عمدہ اور مناسب ہے۔ گویا ایک بدقسمت آدمی ان اعمال پر انحصار کرتا ہے جو اس نے ایمان اور صحیح نیت کے بغیر کیے۔

مکمل کفر کی مثال

آیت نمبر۴۰ کی تمثیل کا تعلق ان سے ہے جو نہ صرف سچائی کو ماننے سے انکار کرتے ہیں‘ بلکہ اخلاقی بصیرت سے بھی محروم ہیں کہ اچھے اور برے اعمال میں فرق نہیں کر سکتے۔ بالکل مسخ شدہ یا نہایت کمزور بنیادی فطرت اور اخلاقی حس سے تہی دامن لوگ جو اپنی ہی خواہشات کے غلام بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صحیح ترین مثال یہ ہے کہ وہ ’’اندھیروں کی موجوں کے نیچے ہیں جو تہہ بہ تہہ ایک دوسرے پر ہیں‘‘۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی کی فطری باطنی روشنی اور بیرونی وحی کی روشنی مل کر ایمان کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور یہی ایمان پھر ان کو چیزوں کی اصل حقیقت‘ جس طرح کہ وہ ہیں‘ دکھاتا ہے۔ جو داخلی فطری روشنی سے محروم ہیں وہ وحی کی روشنی سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے خواہ وہ انہیں میسر ہو ہی جائے۔ وہ ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں بھٹکتے اور اپنے کفر کی پاداش میں حقیقت سے ابدی طور پر محجوب رہتے ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ ﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوۡرًا فَمَا لَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾﴾ ’’جس کو اللہ تعالیٰ نورِ (ہدایت) نہ دے وہ (ایمان کی) روشنی نہیں پا سکتا‘‘۔ oo

اربابِ قلم متوجہ ہوں

وہ احباب جو قلم و قرطاس کے ذریعے دین مبین کی خدمت میں مصروفِ کار ہیں‘ ان سے گزارش ہے کہ وہ قرآنی معارف اور دیگر علمی و فکری موضوعات پر اپنی نگارشات سہ ماہی ’’حکمت قرآن‘‘ میں اشاعت کے لیے ارسال فرمائیں‘ تاکہ قرآنی حکمت و بصیرت کو عام کیا جا سکے اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور غلبۂ دین حق کی راہ ہموار ہو سکے۔

تحریریں اس پتے پر بھیجیں:

مدیر منتظم سہ ماہی ’’حکمت قرآن‘‘ شعبہ تحقیق اسلامی‘ قرآن اکیڈمی 36-K‘ ماڈل ٹاؤن لاہور

فون:3-5869501‘ ای میل:irts@tanzeem.org